Rizwan Ullah
D-178, Abul Fazl Enclave-I
Jamia Nagar, New Delhi - 110025
Tel: +91-9971283786, 9891832189
Email:ruilmi@rediffmail.com
Web: www.Rizwanullah.com

لمعاتِ نصیری

تذکرہ مولوی سید محمد نصیرؒ

رضوان اللہ

ان بزرگ کے بارے میں سب سے پہلے تو یہی عرض کردوں کہ

سنی حکایت ہستی تو درمیاں سے سنی
نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم

بدقسمتی سے ہماری ایک بڑی کمزوری یہ رہی ہے کہ اپنے بزرگوں کے حالات معلوم کرکے اور قلمبند کرکے ان کو محفوظ نہیں کیا۔ مجھے خود اپنی اس کمزوری پر بے حد افسوس ہے۔ اس احساسِ زیاں کی شدت کو کم کرنے کے لیے کچھ جواز تلاش کرتا رہتا ہوں۔ اس میں کچھ صداقت بھی ہوسکتی ہے۔ بات ذرا الٹی سی ہے لیکن حقیقت سے قریب ہے۔ بزرگوں کا بے حد احترام ان سے دوری کا سبب بنا۔ اس احترام کی بنا پر ہم اپنے بزرگوں سے دور رہتے ان سے خود ان کے بارے میں سوالات اور دریافت حالات اور واقعات کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا۔ خود ان بزرگوں نے بھی بچوں کو اپنی ذات کی تہ داریوں سے آگاہ کرنے کی ضرورت نہیں محسوس کی، جس کی بڑی وجہ ان کی بے نفسی اور شان بے نیازی تھی۔ ان بزرگوں کے مقربین اور متوسلین نے بھی تقریباً انہی وجوہ کی بنا پر ان کے ذاتی حالات معلوم کرنے سے احتراز کیا۔ جو کچھ دیکھا سنا اسی کو اکثر و بیشتر صورتوں میں سینہ بہ سینہ منتقل کرتے رہے۔ کچھ حیطۂ تحریر میں لائے بھی تو اس کو محفوظ کرنے کی طرف خاطر خواہ توجہ نہیں کی نتیجہ ظاہر ہے بہت کم معلومات آنے والی نسلوں تک پہنچ سکیں انہیں بھی کچھ متجسس افراد نے دیکھا سنا اور بس! مجھے اس مجموعی صورتِ حال پر بہت افسوس اور ندامت ہے لیکن اب اس نادانی پر کفِ افسوس ملنے اور اپنی اس کمزوری کا اعتراف کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ اس کا بھی کچھ حاصل نہیں، موصوف مولوی نصیر صاحب کے معاملے میں بھی یہی بات درست ہے۔

مولوی نصیر صاحب کا تعلق کسی زمانے میں آکر خیمہ زن ہونے والے بزرگوں کے بسائے ہوئے ایک معمورہ شیخ پور سے تھا جو اب مشرقی یوپی کے ضلع بلیا میں محض ایک اجڑی ہوئی بستی ہے۔ لیکن مولوی صاحب کی زندگی کا ایک بڑا حصہ مشرقی یوپی کے معروف شہر غازی پور میں گزرا جہاں وہ مدرسہ چشمۂ رحمت میں مدرس تھے اور خود ان

کے کہنے کے مطابق ''لوگ ہمیں تیس برس تک نکالتے ہی رہے لیکن نہیں نکال سکے۔'' غالباً مدرسہ کے منتظمین سے ان کی ان بن رہی ہوگی۔ وہ ایک جہانیاں جہاں گشت قسم کے نہایت خوش مزاج انسان تھے۔ گھوم گھوم کر اپنے عزیز و اقارب سے ملتے رہتے تھے۔ چنانچہ مجھ سے ان کی ملاقات کلکتہ میں ہوئی، اپنے آبائی وطن موضع کوئریا پار میں ہوئی جو اس وقت ضلع اعظم گڑھ میں تھا، اب ضلع مئو میں ہے اور پھر زیادہ تفصیلی ملاقات دہلی میں ہوئی جہاں بسلسلۂ ملازمت کلکتہ سے آ کر میں اقامت گزیں ہوا۔

اسی جگہ ایک وضاحت مناسب معلوم ہوتی ہے۔ موضع شیخ پور بزرگوں کی ایک بستی تھی اس کے اطراف میں کئی چھوٹی چھوٹی آبادیاں تھیں مثلاً قاضی پور، ہدیٰ پور، مصطفیٰ آباد، کوتھ وغیرہ۔ لیکن یہاں رہنے والوں کی رشتہ داریاں شیخ پور میں تھیں اور تقریباً ایک ہی قبیل کے لوگ آباد تھے چنانچہ وہ اکثر شیخ پوری کہلاتے تھے۔ میں نے بھی مولوی صاحب کی نسبت شیخ پور سے بیان کی ہے گو کہ وہ اصلاً کوتھ کے رہنے والے تھے۔ اس علاقے کے لوگوں میں میری اچھی ملاقاتیں رہی ہیں اور قرابتیں بھی۔ لوگ بالعموم دیندار ہیں اور خاص بات ان کی سادگی اور بے نیازی ہے۔ نرم خو اور نرم مزاج ہجرت کی نحوست نے ان بستیوں کو ویران کر دیا۔ بزرگوں کے باقیات کو کھود کر نہیں لے جا سکتے تھے وہ کہیں کہیں باقی ہیں اور ان کی داستانیں پسماندگان کے سینوں میں محفوظ ہیں۔ اب وہ بھی گزرتے جا رہے ہیں۔ اللہ اللہ خیر صلا۔

دہلی آنے کے کچھ ہی عرصہ بعد ان سے میری ملاقات ایک ایسے وقت میں ہوئی جب میں اپنے دفتر کی اندرونی سیاست کا شکار ہو گیا تھا۔ برطرفی کی نوٹس مل چکی تھی اور میں بے حد پریشان تھا۔ اسی اثناء میں مولوی صاحب سے بالکل اتفاقی ملاقات ہوئی یا وہ مجھ سے ملنے کے لیے نمودار ہوئے۔ اس وقت میرے حالات سن کر انھوں نے کہا کہ گھبراؤ مت لوگ ہم کو تیس سال تک نکالتے ہی رہے لیکن نہیں نکال سکے۔ میرے ساتھ بھی ایسا ہی کچھ ہوا۔ ایک غیر ملکی سفارت خانے سے وابستہ ہمارے افسران بالا ہمیں برطرفی کی نوٹس دے کر بھی نہیں نکال سکے اور پورے ایک سال تک اس کوشش میں تھک ہار کر آخر وہ نوٹس واپس لی اور مجھے اپنی جگہ پر مستقلاً بحال کیا۔

واقعہ یوں ہوا کہ میں اپنی آزمائش کے اسی زمانے میں ایک شام اپنے گھر کے باہر سڑک پر ٹہل رہا تھا۔ اس وقت میں اوکھلا بس اسٹینڈ کے قریب جامعہ ملیہ کے اسٹاف کوارٹر کے سامنے ایک چھوٹے سے مکان میں رہتا تھا۔ اس وقت اوکھلا بازار کے علاوہ بقیہ علاقے میں آبادی بہت کم تھی جو لوگ تھے وہ بھی زیادہ تر جامعہ ملیہ سے وابستگان تھے اسی زمانے میں پہلے ڈاکٹر نے وہاں اپنی بساط بچھائی تھی۔ یہ ۷۷-۱۹۷۶ء کی بات ہے۔ کوئی رہائش کرائے پر ملنا مشکل تھا لیکن ایک مہربان روض الرحمٰن صاحب عرف بابو جی کی وساطت سے ایک چھوٹا سا کچا پکا مکان مل گیا تھا۔ وہ جامعہ کے قدما میں سے تھے اور بابو جی کے نام سے مشہور تھے۔ وہ بھی شیخ پور کے رہنے والے تھے۔ نشور واحدی صاحب کے چھوٹے بھائی تھے اور ہمارے اقارب میں سے تھے اور مولوی نصیر صاحب کے بھی قریبی عزیز تھے۔ اس شام مولوی صاحب انہی سے ملاقات کے لیے آئے تھے۔ ان کے ایک عزیز اور بزرگ مولانا عبید اللہ صاحب انھیں لے کر آئے تھے جو تبلیغی جماعت کے سربرآوردگان میں سے تھے اور مرکز میں ایک حجرے میں اقامت گزیں تھے اور درس و تدریس میں مصروف رہتے تھے۔ میں نے دیکھا کہ مولانا صاحب اسٹاف کوارٹر کے سامنے کھڑی ایک گاڑی

کے پاس ٹہل رہے ہیں۔ میں بڑھ کر ملا اور دریافت کیا کہ یہاں کس کا انتظار کر رہے ہیں، کہنے لگے کہ نصیر چچا کو واپس لے جانے کے لیے انھی کا انتظار کر رہا ہوں۔ اتنے میں مولوی صاحب بابو جی کے کوارٹر سے نکلے اور مجھے دیکھ کر لپٹ گئے۔ کہنے لگے بابو اب تم ٹھیک جگہ پر آئے ہو۔ میں نے مختصراً اپنی دُردسا بیان کی۔ انھوں نے حیرت سے سنا اور کہا کہ کل دن میں آئیں گے تو تم سے تفصیل سے بات کریں گے۔ چنانچہ وہ اگلے دن آئے اور تفصیل سے بات کی۔

انھوں نے کہا کہ ہاں اب بتاؤ کیا ہوا۔ میں نے انھیں بتایا کہ اس آفس میں میری ملازمت کو ایک سال پورا ہونے سے پہلے ہی یعنی مستقلی سے پہلے ہی ہمارے اوپر کے لوگوں نے سازش کر کے مجھے برطرفی کی نوٹس دے دی ہے اور ۳۰/جون اس کی آخری تاریخ ہے۔ یہ گفتگو ۱۱/جون ۱۹۷۷ء کو ہو رہی تھی۔ انھوں نے میرا پورا نام پوچھا پھر والدہ کا نام پوچھا اس کے بعد آنکھ موند کر اپنی ہتھیلی پر کچھ لکھا پھر آنکھ کھول کر کہنے لگے کہ ۳۰/جون پہلے ہے یا ۲۲/جون؟ میں خاموش رہا تو انھوں نے پھر بہ اصرار پوچھا کہ ۳۰/جون پہلے ہے یا ۲۲/جون؟ میں نے کہا ۲۲/جون۔ تو کہنے لگے بس کچھ نہیں۔ میں نے پوچھا کیا مطلب؟ کہنے لگے ان سبھوں کو بکنے دو کچھ نہیں ہوگا۔ بات آئی گئی ہوگئی۔

لیکن ۲۲/جون کی شام کو جب میں آفس سے آیا اور چائے وغیرہ پی کر لیٹا تو میری اہلیہ نے دریافت کیا کہ آج تو ۲۲/جون تھی؟ میں نے کہا ہاں تو کہنے لگیں کچھ ہوا؟ میں نے کہا ہاں ہوا تو۔ پھر جو کچھ ہوا تھا اس کی تفصیل میں نے بیان کی۔

اس روز شام کو جب آفس کا وقت ختم ہوگیا، سب لوگ جانے لگے میں بھی نکلنے ہی والا تھا کہ کنٹری اکزیکٹیو آفیسر مٹر کرائیزر کی سکریٹری کا فون آیا کہ صاحب بلا رہے ہیں۔ میں ان کے کمرے میں گیا۔ ان کی سکریٹری بھی جا چکی تھیں۔ انھوں نے بیٹھنے کا اشارہ کیا پھر کہا تم کو معلوم ہے کہ تمہاری سروس ختم ہونے کو ایک ہفتہ رہ گیا ہے۔ میں نے کہا جی ہاں۔ اس کے بعد تو معلوم ہوا کہ سیلاب کا بند ٹوٹ گیا اور جو کچھ میرے منہ میں آیا کہتا گیا۔ وہ خاموشی سے سنتے رہے۔ انھیں ساری باتوں کا علم تو تھا ہی برطرفی کی نوٹس پر بھی انہیں کے دستخط تھے لیکن اس دفتری کارروائی سے ہٹ کر معاملے کی حقیقت اور اصلیت کو بھی سمجھ رہے تھے۔ جب میں اپنی بات ختم کر کے کھڑا ہوا تو انھوں نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور کچھ نہیں بولے۔ بس میں آفس سے نکلا اور گھر چلا آیا۔ ۳۰/جون سے ایک دن پہلے ہی مسٹر کرائیزر کے آفس سے مجھے مطلع کیا گیا کہ میری ملازمت میں عارضی طور پر ایک ماہ کی توسیع کر دی گئی ہے۔ پھر اگلے پانچ چھے مہینے تک اسی طرح توسیع کا سلسلہ جاری رہا تا آنکہ نومبر کا مہینہ آگیا پھر اسی ڈرامائی طریقے سے ایک شام مسٹر کرائیزر کی سکریٹری کا فون آیا کہ صاحب بلا رہے ہیں۔ وہاں میں گیا تو کیا دیکھا کہ مسٹر کرائیزر کے علاوہ ہمارے ڈائرکٹر مسٹر ملر بھی موجود تھے۔ ان کے ہاتھ میں ایک لفافہ تھا۔ انھوں نے وہ لفافہ مجھے پکڑا دیا کھول کر دیکھا تو وہ میری مستقلی کا پروانہ تھا۔ اس کے ساتھ ہی مسٹر ملر نے بڑی ندامت کا اظہار کیا۔ کہنے لگے مجھے تمہارے بارے میں غلط اطلاعات دی گئی تھیں۔ مجھے بہت افسوس ہے میری وجہ سے تم کو اتنی تکلیف اٹھانی پڑی۔ کرائیزر صاحب میرے محسن تھے۔ موقع ملا تو ان کا تذکرہ بھی کسی قدر تفصیل سے کروں گا۔ فی الحال مولوی صاحب کا تذکرہ۔

ہم جس زمانے کا ذکر کر رہے ہیں اس وقت یہ کالونی ابوالفضل انکلیو منظور شدہ نہیں تھی یہاں اکا دکا مکانات بنے ہوئے تھے زیادہ تر خالی پلاٹ پڑے ہوئے تھے۔ میں نے بھی ایک پلاٹ تو لے لیا تھا لیکن ذاکرنگر میں کرائے کے ایک مکان میں رہتا تھا۔ چونکہ یہ کالونی منظور شدہ نہیں تھی اس لیے اس کے انہدام کے لیے بلڈوزر چلنے کا اندیشہ ہر وقت رہتا تھا لوگ رات کو جاگا کرتے تھے۔ میں نے مولوی صاحب سے اس کا ذکر کیا تو کہنے لگے کہ مجھے لے چل کر دکھاؤ۔ میں نے ابوالفضل صاحب سے کہا تو انھوں نے اپنے مدارالمہام فیضان صاحب کو اس کام پر مامور کیا۔ وہ ٹیکسی لے کر آئے تو مولانا نے کہا کہ اس کالونی میں کوئی مسجد ہے میں نے کہا ہاں تو کہا کہ وہاں ہمیں لے چلو، لیکن کالونی میں داخل ہونے کے صدر راستے سے لے چلو۔ خیر مسجد کے سامنے پہنچے تو اس کے دکھنی گیٹ سے داخل ہوئے جس کے بائیں طرف ایک گلیارہ تھا اس کے آخر میں کچھ چھوٹا گھرا ہوا تھا۔ پوچھا یہ کیا ہے بتایا گیا کہ یہ پیشاب خانہ ہے بس سر پکڑ کر بیٹھ گئے کہنے لگے کہ ٹھیک امام کے سیدھ میں پیشاب خانہ بنا دیا ہے۔ عذاب نہیں ہوگا تو اور کیا ہوگا، اتنی عقل تم لوگوں کو نہیں ہے۔ اس کے بعد مسجد میں اندر گئے اور دو رکعت نماز پڑھی اس کے بعد کہا کہ ابوالفضل صاحب سے کہہ دو کہ وہاں سے پیشاب خانہ ہٹا دیں کچھ نہیں ہوگا۔ میں نے ابوالفضل صاحب کو بتا دیا۔ انھوں نے اس کو تڑوا دیا اب وہاں جماعت میں آنے والوں کے لیے مہمان خانہ ہے۔ پیشاب خانہ شمالی جانب ایک گوشے میں بنا دیا گیا۔ اس وقت وہ مسجد تو بہت مختصر اور معمولی تھی اب ماشاءاللہ کافی کشادہ ہوگئی ہے۔ ایک صاحب خیر نے اس کے شمال میں ملحق اپنا پلاٹ مسجد کے لیے دے دیا اس سے مسجد زیادہ وسیع ہوگئی اور اب تو ماشاءاللہ کالونی بھی بہت گنجان ہوگئی ہے۔ ہر طرف کئی منزلہ عمارتوں کی قطاریں اور بازار وغیرہ ہیں۔

میں نے اپنے پلاٹ کی باؤنڈری کرادی تھی۔ مولوی صاحب کو وہاں بھی لے گیا۔ جہاں اب ہماری رہائش ہے۔ انھوں نے باؤنڈری کی دیوار کو چھوا پھر کہنے لگے بابو بہت اچھی جگہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس جگہ گلاب کے کھیت تھے تعمیر سے پہلے ایک بوجھ گلاب کے پودے کاٹے گئے۔ بلاشبہ یہ مکان بہت مبارک ثابت ہوا۔

مولوی صاحب جہانیاں جہاں گشت قسم کے بزرگ تھے گھوم پھر کر دور نزدیک اپنے عزیز و اقارب سے ملتے رہتے تھے اور جہاں ضرورت محسوس کرتے رہے ہوں گے روحانی علاج بھی کرتے رہے ہوں گے۔ میرے دہلی آنے سے پہلے کلکتہ میں بھی ان سے ملاقات ہوئی تھی، لیکن اس وقت ان کی کراماتی شخصیت سے میں واقف نہ تھا۔ میرے گاؤں کوئر یا پار بھی گئے۔ وہاں ہمارے صدر مکان سے ملحق دکھن طرف بھی ایک قطعہ مکان تھا، ابا وہیں رہا کرتے تھے۔ مولوی صاحب جب وہاں گئے تو میرے بھائی ڈاکٹر مطیع اللہ ان کو لے کر اس طرف بھی گئے۔ ایک مختصر سا گلیارہ دونوں حصوں کے درمیان بطور گزرگاہ تھا جب اس میں سے مولانا گزرنے لگے تو ایک جگہ رک کر انھوں نے دیوار پر ہاتھ رکھ دیا اور کہا کہ بس یہی جگہ سب سے اچھی ہے۔ دراصل اس دیوار کی دوسری طرف ایک برآمدہ تھا جس میں ابا کی مسہری اور نماز کے لیے ایک چوکی تھی۔ مولانا نے جہاں ہاتھ رکھا تھا، ٹھیک اسی جگہ ابا کی مسہری کا سرہانہ تھا۔ جب واپس آنے لگے تو صدر مکان میں بجانب شمال ایک کھڑکی دیکھ کر انھوں نے پوچھا کہ یہ کیا، اس کو فوراً بند کرو ساری بلاؤں کا راستہ یہی ہے۔ وہ کھڑکی بند تو نہیں کی گئی لیکن اس کے پلے مستقلاً بند کر دیے گئے۔

دہلی میں مولوی صاحب سے ملاقات کا بہت کم موقع ملا، اس لیے ان کے بارے میں زیادہ معلومات نہیں

حاصل ہوسکیں، تاہم میں نے ان سے پوچھ ہی لیا کہ دہلی کیسے آنا ہوا۔ کہنے لگے ہمارے گاؤں میں ایک لڑکی بہت بیمار تھی اس کی دوا کہیں نہیں مل رہی تھی، مجھے اس کی تلاش تھی، جہاں جاتا اسی جستجو میں رہتا۔ علی گڑھ میں ہمارے بھانجے رہتے ہیں انہی کے پاس ایک بار آیا تھا۔ ایک راستے سے گزر رہا تھا کہ ایک جگہ ایک موچی کو دیکھا، وہ گردن جھکائے اپنے کام میں مصروف تھا۔ میں وہیں رک گیا، ذرا دیر بعد اس نے گردن اٹھائی اور میری طرف دیکھ کر کہا کہ کھڑے کیوں ہو، جاؤ۔ میں پھر کھڑا رہا کچھ دیر بعد اس نے پھر میری طرف دیکھا اور ڈانٹ کر کہا کہ جاؤ یہاں سے لیکن میں بیٹھ گیا اور اس سے کہا کہ مجھے ایک دوا کی ضرورت ہے تب وہ بگڑ گیا اور کہا کہ تمہیں کیا یہاں دواخانہ دکھائی دیتا ہے۔ تب میں نے کہا ہاں مجھے جس دوا کی تلاش ہے وہ تمہارے ہی پاس ہے اور میں اسے لے کر ہی جاؤں گا۔ کافی حجت تکرار کے بعد اس نے ایک بقچہ کھولا اور اس میں سے کچھ نکال کر دیا۔ دراصل وہ ایک تعویذ تھا۔ مولوی صاحب کا کہنا تھا کہ میں وہ تعویذ لے کر گیا اور اسی کی برکت سے وہ لڑکی شفایاب ہوئی۔

عقل حیراں ہے اسے کیا کہیے

مولوی صاحب کی وفات ۱۹۹۰ء کے آس پاس ہوئی ٹھیک ٹھیک نہیں معلوم۔

نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم